

سید یوسف رضا گیلانی، وزیراعظم پاکستان

بنام

اسٹنٹ رجسٹرار، عدالت عظمیٰ و دیگر

جواد ایس خواجہ: یہ تحریر آئین کے آرٹیکل 28 اور 251 کی منشاء کے مد نظر لکھی جا رہی ہے۔

1۔ یہ اپیل توہین عدالت آرڈیننس 2003 کی دفعہ (iii) (1) 19 کے تحت دائر کی گئی ہے۔ اپیل کنندہ ملک کے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی ہیں۔ اپیل 2 فروری 2012 کے حکم کے خلاف ہے جو اس عدالت کے ایک سات رکنی بنچ نے جاری کیا۔ مذکورہ حکم یہ ہے کہ اپیل کنندہ کے خلاف توہین عدالت کے ارتکاب کی فرد جرم عائد کی جائے۔ یہ حکم جاری کرنے سے پہلے 16 جنوری 2012 کو معزز سات رکنی بنچ نے اپیل کنندہ کو توہین عدالت آرڈیننس کی دفعہ 17 کے تحت اظہار وجوہ کا نوٹس دیا تھا۔ نوٹس میں عدالت کا اپیل کنندہ سے استفسار تھا کہ کیوں نہ ان کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی، اس بناء پر کی جائے کہ انہوں نے ”ڈاکٹر مبشر حسن و دیگر بنام فیڈریشن آف پاکستان و دیگر“ (PLD 2010 SC 265) کے مقدمہ میں عدالتی احکامات مندرجہ پیرا گراف 178 پر عمل نہیں کیا۔ اس بنچ کے روبرو اس نوٹس کے جواب میں اپیل کنندہ نے تحریری وجوہ دائر نہیں کیں۔ معزز بنچ نے بہر حال انھیں بذریعہ فاضل وکیل جناب اعتر از احسن ابتدائی سماعت کا موقع دیا۔ بعد سماعت فاضل بنچ بادی النظر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انصاف کی بالادستی کے لئے لازم ہے کہ توہین عدالت کے معاملے میں پیش رفت کی جائے۔ لہذا مقدمہ توہین عدالت میں اپیل کنندہ کے خلاف فرد جرم عائد کرنے کے لئے 13-2-2012 کی تاریخ مقرر کی گئی۔ موجودہ اپیل مذکورہ حکم مورخہ 2 فروری 2012 کے خلاف ہے۔ ہم نے بعد سماعت ایک مختصر حکم مورخہ 10 فروری 2012 کے تحت اپیل خارج کر دی تھی۔ اب اس تحریر میں ہم اپنے مختصر حکم کی وجوہات اور قانونی بنیاد قلمبند کر رہے ہیں۔

2۔ ان وجوہ کی آسان تفہیم کے لئے ہم نے اس تحریر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں ان حالات و واقعات کا مختصر بیان ہے جن کی وجہ سے اپیل کنندہ کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی شروع کرنا پڑی یہ مختصر بیان دوسرے اور تیسرے حصے میں دیے گئے قانونی اور اہم آئینی اصولوں کا پس منظر فراہم کرتا ہے۔

I حالات و واقعات کا مختصر بیان

3۔ زیر نظر مقدمہ کی جڑیں 2007 میں وقوع پذیر کچھ واقعات میں ہیں۔ اُس سال آئین کے آرٹیکل 184 کے تحت اس عدالت میں چند قانونی درخواستیں دائر کی گئیں جن میں قومی مفاہمتی آرڈیننس (NRO) کی آئینی حیثیت کو ہدف بنایا گیا تھا۔ NRO اس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے یکم اکتوبر 2007 کو آئین کے آرٹیکل 89 میں دیئے گئے اختیارات کو مبینہ طور پر استعمال کرتے ہوئے نافذ کیا۔

NRO کے تحت چند مخصوص افراد کو عدالتی احتسابی عمل سے استثنیٰ فراہم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں جنرل پرویز مشرف نے NRO اور بعض دیگر قوانین کو دوام دینے کی خاطر کچھ غیر آئینی اقدامات بھی اٹھائے۔ اس عدالت نے ڈاکٹر مبشر حسن کے مقدمہ میں ان غیر آئینی اقدامات کو کالعدم قرار دیا۔ پارلیمان نے بھی NRO کو قانونی حیثیت دینے سے انکار کیا اور NRO کے متبادل کوئی قانون سازی نہ کی۔

4۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے مقدمہ کے تحریری فیصلہ میں اس عدالت نے چند اہم واقعات کا ذکر کیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ (Switzerland) کی عدالتوں میں لگ بھگ 6 کروڑ ڈالر کی بازیابی سے متعلقہ کچھ مقدمات زیر سماعت یا تفتیش تھے۔ اس وقت کے اٹارنی جنرل ملک محمد قیوم نے ان مقدمات کے سلسلے میں بعض خطوط سوئٹزرلینڈ کے حکام کو بھیجے۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق اٹارنی جنرل سوئٹزرلینڈ کے حکام سے خط و کتابت کے مجاز نہیں تھے۔ لہذا عدالتی فیصلہ یہ تھا کہ ان خطوط اور مراسلات کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ان مراسلات کے ذریعے پاکستان کی طرف سے دی گئی درخواست برائے ”باہمی قانونی معاونت“ و درخواست برائے ”بنائے جانے فریقِ مقدمہ“ واپس لے لی گئیں۔ اس غیر قانونی اقدام کی واپسی کی خاطر مذکورہ بالا پیرا گراف 178 میں اس عدالت نے وفاقی حکومت اور دیگر متعلقہ حکام کو یہ حکم دیا کہ وہ فوراً مندرجہ بالا مقدمات کی بحالی کے لئے تمام ضروری اقدامات کریں۔

5۔ ڈاکٹر مبشر حسن کے مقدمہ میں عدالتی فیصلے کے خلاف وفاقی حکومت نے نظر ثانی (review) کی درخواست دائر کی جسے 25 نومبر 2011 کو بعد سماعت خارج کر دیا گیا۔ لہذا عدالتی فیصلے میں دیئے گئے اقدامات کی حیثیت اب حتمی ہے اور اس پر عملدرآمد آئین کی رو سے لازم بھی۔ ان احکامات پر ابھی تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ اسی لئے ان پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کی خاطر اپیل کنندہ کے خلاف کارروائی زیر آرڈیننس 2003 کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں یہ دہرانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر مبشر حسن کا فیصلہ 16 دسمبر 2009 کو ہوا جب کہ نوٹس اظہارِ وجوہ 16 جنوری 2012 کو جاری ہوا۔ اس عرصے میں متعدد تاریخوں پر عدالت نے احکامات مندرجہ پیرا گراف 178 کے نفاذ کی خاطر کارروائی کی۔ ان تمام تواتر سماعت کا تفصیلی بیان یہاں ضروری نہیں کیونکہ ان واقعات کا بہتر جائزہ فاضل سات رکنی بنچ لے سکتا ہے۔

حالات و واقعات کے اس مختصر بیان کے بعد اب ہم فیصلے کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔

II اپیل کنندہ کے دلائل اور ان کا جائزہ

6۔ ہمارے سامنے اپیل کنندہ کا یہ موقف نہیں کہ NRO فیصلے میں درج احکامات پر عمل درآمد کر دیا گیا ہے۔ بلکہ موجبات اپیل کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ یہ عمل درآمد اب تک نہیں ہوا۔ فاضل وکیل اپیل کنندہ کا استدلال یہ ہے کہ اپیل کنندہ نے دانستہ طور پر حکم عدولی کی نیت سے ایسا نہیں کیا، لہذا اپیل کنندہ کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کا قانونی جواز نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ فاضل وکیل کو معزز سات رکنی بنچ نے مکمل حق سماعت فراہم نہیں کیا اور آخر میں یہ کہ حکم مورخہ 2 فروری 2012 میں، حکم کی تائید میں وجوہات بیان نہیں کی گئیں۔ ان معروضات کی بنا پر فاضل کا وٹنسل کی استدعا ہے کہ حکم زیر اپیل کو کالعدم قرار دیا جائے۔

7۔ اب ہم مندرجہ بالا معروضات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔ موجودہ اپیل میں جس نکتے پر بہت زور دیا گیا ہے، وہ ارتکاب توہین عدالت میں نیت کا شامل نہ ہونا ہے۔ اس بنا پر اپیل کنندہ کا موقف ہے کہ اگر NRO کے فیصلے پر عمل درآمد نہیں بھی ہوا تو بھی وہ توہین عدالت کے سزاوار نہیں کیونکہ اس میں اُن کی ارتکاب جرم کی نیت نہ تھی۔ اس اپیل کا بنیادی نکتہ یہی ہے۔ اس اپیل میں اس نکتے پر حتمی رائے دینا ضروری ہے، نہ مناسب۔ کیونکہ یہ دلائل اور ان پر شواہد ابھی سات رکنی بنچ کے سامنے پیش ہونا ہیں اور ہمارے لیے اس موقع پر ان پر کوئی بھی بات کرنا غیر مناسب ہے۔ البتہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اپیل کے مندرجات سے یہ واضح ہے کہ اپیل کنندہ کو NRO فیصلے کے پیرا گراف 178 میں دئے گئے عدالتی احکامات کا پورا علم تھا اور یہ بھی واضح ہے کہ ان احکامات پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔ اپیل کنندہ نے اس دلیل پر بھی انحصار کیا ہے کہ انہوں نے مجاز سرکاری افسروں کے مشوروں پر عمل کیا اور ان کی تیار کردہ تجاویز (summaries) پر عمل کیا۔ موجبات اپیل اور عذرات مندرجہ بالا اپنی جگہ قابل غور ہیں، لیکن سات رکنی بنچ کے روبرو، نہ کہ ہمارے سامنے۔ بہر حال اس بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ NRO فیصلے پر عمل درآمد اب تک نہیں ہوا۔

8۔ قانون کے تحت عدالت کو ابتدائی سماعت اور اس کی بنیاد پر ابتدائی فیصلہ اور باقی النظر رائے قائم کرنے کی خاطر تفصیلی جائزے کی ضرورت نہیں کیونکہ ابتدائی سماعت میں مکمل شہادتوں کو ریکارڈ پر لانا ضروری نہیں ہوتا۔ فاضل بنچ کو صرف یہ اطمینان کرنا ہے کہ اس کے پیش آمدہ ریکارڈ کے مطابق فرد جرم عائد کرنے کا کچھ جواز ہے یا نہیں۔ یہ اصول

جسٹس حسنت احمد خان کے مقدمہ میں طے کر دیا گیا ہے۔ (PLD 2011 SC 68)۔ یہاں پر اس طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ توہین عدالت آرڈیننس کی دفعہ 3 کے تحت ارادی حکم عدولی یا عدالتی حکم کو نظر انداز کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے اور ارتکاب کرنے والے کے خلاف بادی النظر میں کارروائی کرنے کا جواز پیش کرتا ہے۔ لہذا اس اپیل کے حقائق کی روشنی میں جب ہم دفعہ 3 مذکورہ بالا کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ امر عیاں ہے کہ حقائق کی تفصیلی پرکھ ضروری ہے جو کہ محض ابتدائی سماعت سے اور بلا شواہد ممکن نہیں کیونکہ ابتدائی سماعت میں مکمل شہادتوں کو ریکارڈ پر لانا ضروری نہیں ہوتا۔ مزید برآں جو موجبات اپیل کنندہ نے اپنے دفاع میں پیش کی ہیں وہ حقائق و واقعات کے تفصیلی جائزے کی متقاضی ہیں، کیوں کہ اپیل کنندہ کے دفاعی موجبات پر ابتدائی سماعت کی بنیاد پر حتمی فیصلہ، مقدمے کے قطعی فیصلے پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپیل کنندہ کو سات رکنی بنچ کے سامنے شواہد پیش کرنے اور اپنے دفاع میں ان شواہد پر مبنی دلائل پیش کرنے کا مکمل استحقاق ہے۔

9۔ یہاں ہم یہ کہنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ شواہد وصول کرنا اور شہادتیں قلم بند کرنا ابتدائی سماعت کے دائرے میں شامل نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل وکیل اپیل کنندہ ”ابتدائی سماعت“ کی اصطلاح کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے جو کہ توہین عدالت آرڈیننس کی دفعہ (1) 17 میں درج ہے۔ جسٹس حسنت کے مقدمے میں یہ نکتہ طے شدہ ہے کہ جب عدالتی حکم کی پاس داری نہ ہو اور یہ حقیقت مسلمہ ہو تو عدالت متعلقہ شخص کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کرنے کی مجاز ہو گی۔ اس مقدمے میں سات رکنی بنچ نے یہی قانونی طرز عمل اختیار کیا ہے۔ عدالت اظہار وجوہ کا نوٹس یقیناً واپس لے سکتی ہے مگر صرف اس صورت میں کہ متعلقہ شخص عدالت کو ذمہ دارانہ اطلاع دے دے کہ فیصلے پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔ نوٹس اظہار وجوہ عدالت کی صواب دید پر اس صورت میں بھی واپس لیا جاسکتا ہے جب متعلقہ شخص عدالت کو یقین دہانی کرا دے کہ اس سے جو فیصلہ نظر انداز ہوا، اب اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔ البتہ اگر دونوں صورتیں سامنے نہ آئیں اور اس کے برعکس واقعات پر مبنی دفاعی موجبات پیش کی جائیں تو قانونی طور پر مناسب لائحہ عمل کسی بھی عدالت کے لئے یہی ہوگا کہ متعلقہ شخص پر فرد جرم عائد کی جائے اور مذکورہ شخص کو اپنے دفاع میں دستاویزی اور زبانی شہادتیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔

10۔ اپیل کنندہ کا یہ کہنا کہ معزز سات رکنی بنچ نے انہیں مکمل سماعت کا موقع فراہم نہیں کیا، مقدمے کے واقعات کے مطابق درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس بارے میں بھی یوں لگتا ہے کہ فاضل وکیل اپیل کنندہ اُسی ابہام کا شکار ہیں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فاضل وکیل اور خود اپیل کنندہ کو فاضل بنچ نے سماعت کا موقع دیا جس حد تک ابتدائی سماعت میں دیا جانا مناسب تھا۔ مناسبت کا تعین ہر مقدمے کے منفرد حقائق کی روشنی میں ہوتا ہے۔ اس مقدمے کے حقائق و واقعات کا جائزہ

لینے سے یہ بالکل واضح ہے کہ اپیل کنندہ اور ان کے فاضل وکیل کو مناسب اور کافی موقع دیا گیا اور سماعت کے بعد فاضل
بجٹ نے اپنی ابتدائی رائے بادی النظر میں قائم کی۔ یہ قانونی تقاضا پورا کرنے کے بعد ہی فاضل بجٹ نے فرد جرم عائد کرنے اور
کارروائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

11۔ فاضل وکیل نے دوران سماعت قانونی نظائر بھی کثرت سے پیش کیے۔ ہماری رائے میں بیشتر نظائر ایسے ہیں
جو ابتدائی سماعت کے قانونی تقاضوں کے بارے میں نہیں بلکہ حتمی اور قطعی فیصلوں کے بارے میں ہیں۔ لہذا پیش کردہ نظائر
کی اس مقدمے سے مناسبت نہیں۔ یہ اس وجہ سے بھی واضح ہے کیونکہ ابتدائی سماعت اور حتمی سماعت کی تفریق قانون میں
واضح طور پر طے شدہ ہے۔ اس پر بحث درکار نہیں۔

12۔ فاضل وکیل اپیل کنندہ نے مقدمہ بہ عنوان ”عمران اللہ بنام سرکار“ (1954 FC123) پر
بہت زور دیا۔ انہوں نے خاص طور پر اس اقتباس کا حوالہ دیا جہاں جسٹس کارنیلیس نے اس اصول کا اعادہ کیا ہے کہ عدالت
کو اس بات کی تسلی کر لینی چاہیے کہ فاضل وکیل اپنے دلائل میں مزید کچھ ایزا د نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رکھنا
ضروری ہے کہ عمران اللہ کا مقدمہ کسی ابتدائی سماعت کے بارے میں نہ تھا بلکہ فیڈرل کورٹ ایک ایسے فیصلے کے خلاف
سماعت کر رہی تھی جو کہ لاہور ہائی کورٹ نے حتمی سماعت کے بعد کیا تھا۔ عمران اللہ کے مقدمے اور موجودہ مقدمے میں یہ
بنیادی فرق ہے۔ دوسرا یہ کہنا بھی موزوں ہوگا کہ ابتدائی سماعت کے دوران تمام دلائل پر بحث کی کوئی ضرورت نہیں، صرف
اتنی بحث درکار ہوتی ہے جس سے عدالت بادی النظر میں مطمئن ہو سکے۔ مکمل بحث تو صرف اس وقت ضروری ہوگی جب فرد
جرم عائد کرنے کے بعد شواہد پیش ہوں گے اور پھر ان شواہد اور قانون کی روشنی میں عدالت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا اپیل
کنندہ تو بین عدالت کا مرتکب ہوا ہے یا نہیں۔ درحقیقت عمران اللہ کے مقدمے کی نظیر ہمارے مختصر حکم مورخہ 10 فروری
2012 کی تائید کرتی ہے۔ مذکورہ مقدمے میں جسٹس اکرم نے کہا کہ ”اگرچہ وہ مقدمے کو واپس ہائی
کورٹ بھجوانے کی طرف مائل تھے لیکن چونکہ فیڈرل کورٹ میں ہی تفصیلی اور سیر
حاصل بحث سماعت ہو گئی تو اب کیس کو واپس لوٹانا بے مقصد ہوگا“۔ اس اپیل میں
بھی ہم نے بہت مفصل بحث سماعت کی ہے اور فاضل وکیل کو ہر پہلو پر بحث کا پورا پورا موقع دیا ہے۔ چنانچہ یہ مقدمہ واپس
فاضل سات رکنی بجٹ کو بھجوانے کا جواز نہیں۔

13۔ فاضل وکیل نے جسٹس حسنت کے مذکورہ بالا مقدمے کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ سپریم کورٹ کے ایک
چار رکنی بجٹ نے وہاں تقریباً چار ماہ تک ابتدائی سماعت کی تھی۔ ان کا اشارہ تھا کہ انہیں بھی اتنے ہی طویل عرصے تک سنا

جائے۔ یہ غیر موزوں بات ہے کیوں کہ ہر مقدمے کے الگ اور منفرد حقائق و موجبات ہوتے ہیں۔ عمران اللہ کے مقدمے میں جسٹس کارنیلیس کی ایک وضاحت فاضل وکیل کی استدعا کا مکمل جواب فراہم کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ”سماعت کی اصطلاح کو کسی رسمی معمول سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا“، جسٹس حسنا کے مقدمے کا اہم بنیادی نکتہ فاضل وکیل نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اُس مقدمے میں سوال یہ تھا کہ آیا آئین اور قانون میں اس امر کی گنجائش ہے کہ منصب پر فائز ہائی کورٹ کے کسی جج کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

اس سوال سے ہی واضح ہے کہ معاملہ آئینی دائرہ اختیارات کا تھا اور اس معاملے میں شواہد کی قطعاً ضرورت نہ تھی کیونکہ سوال خالصتہً قانونی اور آئینی نوعیت کا تھا۔ مزید براں چونکہ یہ معاملہ اپنے منفرد حقائق میں پہلی بار ابھرا تھا اور اُس مقدمے میں بہت سے جج صاحبان شامل تھے اور ہر جج کا اپنا ایک وکیل تھا، ان تمام وجوہات کی بنا پر اگر اُس مقدمے میں ابتدائی سماعت پر وقت لگا تو اس مقدمے کے حالات و واقعات سرے سے ویسے نہیں ہیں۔ لہذا جسٹس حسنا کا مقدمہ اس مقدمے سے مناسبت نہیں رکھتا۔

14۔ جسٹس حسنا کے مقدمے میں توہین عدالت آرڈی نینس کے مختلف پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس بات کو صراحت سے بیان کیا گیا کہ بادی النظر رائے قائم کرنے کے لئے یہ قطعاً ضروری نہیں کہ تمام واقعات و شواہد کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے بلکہ ایسی رائے قائم کرنے کے لئے عدالت کے اطمینان کی خاطر صرف اتنا ہی کافی ہے کہ توہین عدالت کے عناصر بادی النظر میں پائے جاتے ہیں۔

15۔ جسٹس حسنا کے مقدمے میں توہین عدالت آرڈی نینس کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ ہماری اس رائے کو مزید تقویت پہنچاتی ہے کہ فاضل سات رکنی بنچ نے جو حکم 2 فروری 2012 کو جاری کیا، وہ قانون کے عین مطابق ہے۔ لہذا ہم فاضل وکیل سے متفق نہیں کہ اپیل کنندہ کی طرف سے پیش کردہ تمام دفاعی معروضات پر فیصلہ لازم تھا۔

III آئینی تقاضے

16۔ اس مقدمے میں چند اہم آئینی پہلوؤں کا جائزہ لینا مقصود ہے جن کے مطابق فاضل بنچ کے فیصلے کا جواز ملتا ہے۔ موجودہ فیصلے کے اس حصے کو ہم اسی سوال تک محدود کرتے ہیں جس میں اپیل کنندہ نے عدالت سے استدعا کی ہے کہ اُن کے آئینی منصب کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدالت خصوصی درگزر سے کام لے کیونکہ عوام کی کاوشوں سے حاصل کردہ جمہوری نظام کا استحکام اس مقدمے کے فیصلے پر موقوف ہے۔ یہ ایک ایسی استدعا ہے جو حیران کن ہے اور باعث تعجب

بھی، کیونکہ یہ سوال حکومت کے اعلیٰ ترین انتظامی منصب پر فائز شخصیت نے اٹھایا ہے۔ اس سوال میں وہ اپنے لیے کسی خاص رعایت اور خصوصی برتاؤ کے خواہاں ہیں تاکہ وہ قانون اور آئین کے مساوی برتاؤ کے اصول کی زد میں نہ آئیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ عدالت اپنا فیصلہ قانونی تقاضوں کے بجائے اس مقدمے کے ممکنہ نتائج ملحوظ رکھتے ہوئے ڈھالے۔ دوسرے لفظوں میں اپیل کنندہ عدالت کو یہ درخواست کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ معتبوب و مدفون اُس ”نظریہ ضرورت“ کو دوبارہ زندہ کیا جائے جس نے ماضی میں ملک کے آئینی نظام کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ درحقیقت اپیل کنندہ کے خصوصی برتاؤ کے تقاضے کو صرف آئین کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

(۱) خاص رعایت

17- آئین کے مجموعی جائزے سے یہ بات واضح ہے کہ اپیل کنندہ کو نہ تو کوئی خاص مراعات میسر ہیں اور نہ ہی کسی خصوصی درگزر کا حق حاصل ہے جس کے تحت ان کو توہین عدالت کے قانون سے ماوراء قرار دیا جائے۔ آئین کے ابتدائیہ (preamble) آرٹیکل 5 اور آرٹیکل 25 اس امر کی وضاحت کے لئے کافی ہیں۔ آئین کے ابتدائیہ کی اہمیت یہ ہے کہ اُس سے آئین کی صحیح تشریح و تعبیر ممکن ہے جیسا کہ منیر حسین بھٹٹی کے مقدمہ (PLD 2011 SC 407) میں اور اس سے پہلے دیگر مقدمات میں ہم نے واضح کیا ہے۔ ابتدائیہ میں چند اصول وضع کر دیے گئے ہیں جن پر آئین کی بنیاد رکھی گئی ہے لہذا انہی اصولوں کے مطابق آئین کی تعبیر ہوگی۔ ان میں اسلامی مساوات کے اصول شامل ہیں جنہیں ہمیشہ ملحوظ رکھے جانے کی تاکید ہے۔ آئین کے مختلف مندرجات اسی اصول پر مبنی ہیں۔ ان میں آرٹیکل 5 ہے جس کے تحت آئین اور قانون کی اطاعت یکساں طور پر ہر شہری کی ناگزیر ذمہ داری ہے۔ یہاں پر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ آئین میں اس ذمہ داری سے استثناء کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اپیل کنندہ جن خصوصی مراعات اور درگزر کے خواہاں ہیں، اُن کا کوئی آئینی جواز نہیں۔

18- اسی طرح آرٹیکل 25 میں بہت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ پاکستان کے تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں۔ ان آئینی مندرجات کا مجموعی اثر نہایت قوی ہے اور کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارا آئین اور قانون اپیل کنندہ کو کوئی ایسا امتیازی مقام نہیں دیتا۔ لہذا باوجود اس کے کہ اپیل کنندہ ملک کے منتخب وزیراعظم اور اس لحاظ سے عزت و احترام کے مستحق ہیں، عدالت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپیل کنندہ کو کوئی بھی ایسی سہولت دے جو ماورائے آئین و قانون ہو۔

19- یہ آئینی اصول اُس دائمی حکمت کی عکاسی کرتے ہیں جو مدبرانہ نظام حکومت کی اساس ہے۔ یہاں حضور

سرور کائنات ﷺ کی حدیث مبارکہ کو دہرانا بے حد ضروری ہے جس میں اسلام کی حقیقی روح کے مطابق مساوات کا وہ درس ہے جس کا ذکر آئین کے ابتدائے میں ہے، اور جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں۔ ایک با اثر عرب قبیلے کی خاتون پر چوری کا الزام تھا۔ حضور اکرم ﷺ کو کچھ اشخاص نے درخواست کی کہ وہ خاتون کے اعلیٰ حسب نسب کے پیش نظر اُس سے کچھ خصوصی رعایت برتیں۔ حدیث مبارکہ میں حضور اکرم ﷺ کے سخت رد عمل کا ذکر ہے۔ انہوں نے اس درخواست کو رد کرتے ہوئے جو انتباہ کیا وہ تمام حکومتی عہدے داروں کے لئے نصیحت ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اما بعد، فانما اهلك الناس قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد“ (صحیح بخاری)

(آزاد ترجمہ) ”اے لوگو! تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں، اُس کی وجہ یہ تھی کہ جب کوئی با اثر (”شریف“) چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے لیکن جب کمزور (”ضعیف“) چوری کرتا تو اُس پر قانونی سزا لاگو کی جاتی۔“

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس قاضی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جو اپنی مسند منصبی سے اُن کے احترام میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے، کیونکہ یہ عمل قانون اور مساوات کے اسلامی اصول کے منافی تھا۔

20۔ خصوصی رعایت کے لئے اپیل کنندہ کی درخواست کو رد کرنے کے لئے ہمیں صرف مذکورہ بالا اصولوں کو سمجھنے اور حقیقی طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت جو صورت حال آئین کے مندرجات اور تقاضوں سے ابھرتی ہے، وہ اپیل کنندہ کی خواہش کے بالکل برعکس ہے۔ آئینی نظریہ تو یہ ہے کہ منصب جس قدر بلند ہوگا، اُسی تناسب سے منصب دار کا بارِ ذمہ داری بھی زیادہ ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آئینی منصب پر فائز اصحاب آئین کے تحت حلف لیتے ہیں کہ وہ آئین کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔ جبکہ عام شہری ایسا حلف نہیں لیتا۔ وزیراعظم کے حلف نامے میں تو یہ بھی شامل ہے کہ وہ آئین کے تحفظ اور اس کے دفاع کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس طرح اُن کی ذمہ داری خاصی بڑھ جاتی ہے۔ لہذا عدالت کو خصوصی تشویش ناگزیر ہوگی اگر اپیل کنندہ کے بارے میں یہ امکان نظر آئے کہ ان سے تو بین عدالت سرزد ہوئی ہے۔

21۔ اب ہم اس آئینی توضیح کے بارے میں مزید تفصیل بیان کرتے ہیں۔

(ب) آئینی عہدے داروں کے فرائض امانت (fiduciary duties)

22۔ آئین کے ابتدائے میں اس امر کی تحریری وضاحت صریح الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ آئینی نظام عوام ہی کا بنایا ہوا اور دیا ہوا ہے اور یہ کہ ریاستی امور عوام کے منتخب نمائندگان کے ذریعے انجام دیئے جائیں گے۔ اس متن

سے یہ عیاں ہے کہ منتخب عوامی نمائندگان بہ شمول اپیل کنندہ درحقیقت عوام کے حقوق کے محافظ اور پاسدار ہیں۔ اس عدالت نے پہلے بھی یہ وضاحت کر دی ہے کہ ریاستی عہدے داروں کا عوام کے ساتھ تعلق امانتی نوعیت (fiduciary) کا ہے اور وہ عوام کو جواب دہ ہیں جن سے وہ اپنی تنخواہیں اور مراعات لیتے ہیں ”محمد یاسین بنام وفاق پاکستان“ (PLD 2012 SC 132)۔

23۔ امانتی تعلق کے مضمرات کیا ہیں؟ ان کی وضاحت ہمارے علم قانون اور نظائر میں موجود ہے۔ دیگر خصوصیات کے علاوہ، امانتی فرائض کا ایک بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ریاستی عہدے داران تمام تر دیانت اور وفاداری کے ساتھ آئین کی عملداری یقینی بنائیں چونکہ آئین ہی پاکستان کے عوام کی منشاء کا اصل مظہر ہے۔ اور چونکہ آئین عوامی منشاء کا مظہر ہے، اس لئے ریاستی عہدے داروں کا امانتی فریضہ ہے کہ وہ اپنے تمام تر عمل کو آئین کے مطابق استوار کریں۔ یہ آئینی اصول اور زیادہ اہمیت اس وقت اختیار کر لیتا ہے جب معاملہ عوام کے کثیر زر مبادلہ سے متعلق ہو، خاص طور پر جب ملکی ادائیگیوں کے توازن (balance of payments) میں بہتری اور اس ذریعے سے ملکی معیشت کچھ مستحکم ہو سکتی ہو اور عوام کا بھلا ہو سکتا ہو۔ حقائق کے اس پس منظر میں ہم بخوبی اس حکمت کا احاطہ کر سکتے ہیں کہ آئین کے آرٹیکل 190 میں کیوں یہ حکم ہے کہ ”پاکستان بھر کے تمام انتظامی اور عدالتی ادارے سپریم کورٹ کی معاونت کرے پابند ہوں گے“۔ اس تناظر میں یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ انتظامیہ اور عدلیہ کا ایک ہی مشترکہ مقصد ہے اور وہ یہ کہ دونوں ریاستی ادارے آئین میں منعکس ہونے والی عوام کی منشاء کو اپنا مشترکہ شعار بنائیں۔ یہی آئین اور ہمارے جمہوری نظام کا نچوڑ ہے۔ یہاں یہ بھی کہنا لازم ہے کہ آئین کی رو سے دونوں اداروں کے مابین کسی اختلاف کی گنجائش نہیں اور نہ ہی اداروں یا افراد کی باہمی انایا بالادستی کا مسئلہ درپیش ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ نہایت عجز کے ساتھ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ادارے اور ان کے عہدے داران ایک ہی مشترکہ مالک یعنی عوام کے خدمت گذار ہیں۔

24۔ مذکورہ بالا اصول کے بہتر ادراک کے لئے امانتی تعلق جو کہ عوام اور ریاستی عہدے داروں کے مابین استوار ہے، کو اپنے تاریخی پس منظر میں اجاگر کرنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے وزیراعظم لیاقت علی خان کی اُس تقریر کی خاصی اہمیت ہے جو انہوں نے 1949 میں آئین ساز اسمبلی میں کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ”عوام ہی کو تمام اختیارات کا محور تسلیم کیا گیا ہے اور تمام (ریاستی) قوت انہی میں مرکوز ہے“۔ آئین ساز اسمبلی کے ایک اور رکن جناب سرش چندرا چھٹا پدھایا کی تقریر میں بھی اسی جذبے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے انتہائی عاجزی سے یہ کہا کہ ”ہمارے ملک کے عوام ہمارے مالک و حاکم ہیں اور ہم ان کے ملازم“۔ یہی وہ نظریات ہیں جن پر ہمارے آئین کی بنیاد ہے اور انہی احساسات کو ہمارے ریاستی اداروں اور عہدے داروں کا

نصب العین ہونا چاہیے۔

25۔ ہمارے بانی اسلاف کے یہ نظریات درحقیقت عصرِ حاضر کے پیرائے میں اُس ازلی حکمت کا تسلسل ہیں جو سید القوم خادمہم (قوم کے سرداران کے خادم ہوتے ہیں) میں بیان ہوئی تھی۔ ہمارا آئین اسی اصول کا مجسم ہے، کیونکہ وہ ملک کے اعلیٰ ترین انتظامی عہدے دار پر یہ ذمہ داری ڈالتا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ایسی ذمہ داری سے پہلو تہی عوام اور عدالتوں کے لئے یکساں تشویش کا باعث ہونی چاہیے۔

26۔ عدالت اعلیٰ منصب پر فائز کسی بھی عہدے دار کے ساتھ ترجیحی برتاؤ اس لئے بھی روا نہیں رکھ سکتی، کیونکہ ایسا کرنے سے پورے معاشرے میں لا قانونیت کو فروغ ملے گا۔ جیسا کہ شیخ سعدی کی دائمی بلند فکری میں منعکس ہے۔

بہ بیخ بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد
زند لشکر یانش ہزار مرغ بہ سیخ

(باب در سیرت پادشاہان، گلستان سعدی)

یعنی اگر حاکم وقت صرف پانچ انڈوں کے برابر ستم روا رکھے گا تو اُس کے لشکری ہزار مرغ کباب کر جائیں گے۔

27۔ ایک آئینی نظام حکومت میں حکومت سے یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ وہ اپنے عمل سے قانون کی حکمرانی کی مثال قائم کرے گی۔ ”سندھ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن“ کے مقدمے (PLD 2009 SC 879) میں جب سابق فوجی آمر کے غیر آئینی اقدامات کو کالعدم اور رد کیا گیا تو اس امر کی نشاندہی کی گئی تھی، اور ایک سوال اٹھایا گیا تھا۔ اُس فیصلے کے اڑھائی سال بعد وہی سوال تمام ریاستی عہدے داروں اور تمام غور و فکر کرنے والے لوگوں سے کرنا ضروری ہے: ”آیا قانونی بالا دستی کے فقدان نے جو کہ ریاست کے اعلیٰ طبقے اور اداروں میں پایا جاتا ہے، کہیں اس لا قانونیت کو تو نہیں بڑھایا جو کہ ہمارے معاشرے میں بدقسمتی سے رائج ہو گئی ہے“؟ اڑھائی سال پہلے بھی اور آج بھی ان دونوں میں گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ یہ ایک اور وجہ ہے جس کے باعث عدالتیں موجودہ مقدمے میں اپیل کنندہ کو خصوصی رعایت نہیں دے سکتیں۔

28۔ اب چوں کہ بادی النظر رائے قائم ہوئی ہے اور یہ رائے بلا جواز نہیں، لہذا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فاضل سات رکنی بنچ نے جو حکم مورخہ 2 فروری 2012 کو جاری کیا، وہ قانونی تقاضے پورا کرتا ہے۔

(ج) اندیشہ سودوزیاں یا قانون کی بالادستی؟

29۔ اس مرحلے پر اب ہم اپیل کنندہ کے فاضل وکیل کی اُس تشویش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ ”جمہوری نظام کا استحکام اس مقدمے کے فیصلے پر موقوف ہے“۔ یہ تشویش کسی حد تک بجا ہے کیونکہ اس مقدمے کا تعلق آئین کی بالادستی سے ہے اس لئے مقدمے کا نتیجہ واقعہً اہم ہے۔ مگر جہاں تک متوقع سودوزیاں کے اندیشہ کی بات ہے تو ماضی میں بھی یہ عدالت اس قسم کے دلائل رد کر چکی ہے۔ NRO فیصلے میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ عدالت اپنے فیصلے وقتی مصلحت یا آئین کے اطلاق سے پیدا ہونے والے نتائج کے پیش نظر نہیں کرتی اور نہ ہی اُسے ایسا کرنا چاہیے۔ بحیثیت عدالت ہم آئین اور قانون کے پابند ہیں اور اپنے فیصلوں کی بنیاد انہی پر رکھتے ہیں نہ کہ ان کے متوقع نتائج پر۔ ایسا کرنے سے ہم دوبارہ اسی معتب ”نظریہ ضرورت“ کی طرف چل نکلیں گے جس کو پاکستان کے عوام نے والہانہ جدوجہد سے دفن دیا ہے۔ NRO فیصلے میں یہ کہا گیا ہے کہ آئین کے احترام اور تقدس سے لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے سیاسی استحکام پیدا ہوگا اور قانون کی حکمرانی کا بول بالا ہوگا۔ عدالت قانون کی بالادستی کو آئین کی پاس داری ہی سے قائم رکھ سکتی ہے جو کہ ملک کا اعلیٰ قانون (supreme law) ہے۔

30۔ اسی اصول پر بلا خوف و خطر اطلاق اور آئین پر کاربند رہنے کی وجہ سے حال ہی میں پاکستان میں دم توڑتی جمہوریت کو نئی زندگی ملی ہے۔ یہی اصول اب بھی جمہوریت کی بقا کا ضامن ہے۔ اگر اس مقدمے کے حالات و واقعات کی وجہ سے اپیل کنندہ کو جمہوری نظام کے غیر مستحکم ہونے کا خدشہ ہے تو یہ خدشہ قانون پر عمل درآمد کرنے سے بہ آسانی دور ہو سکتا ہے۔

(د) آئین کی حاکمیت اور توہین عدالت کا قانون

31۔ اپیل کنندہ کے فاضل وکیل کے دلائل سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اس وسیع تر آئینی نظام کے بنیادی تصورات اور ان پہلوؤں سے کما حقہ واقف نہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ریاست کے ہر جزو اور اس جزو کے عہدے داروں کو اپنا اپنا کام کرنا ہے۔ یہ بات معروف ہے کہ ریاست کے تمام اجزاء اور ان کے عہدے دار اپنے منصب کی قانونی حیثیت (legitimacy) آئین ہی سے حاصل کرتے ہیں۔

32۔ وزیراعظم کے دائرہ اختیار کا تعین آئین کے آرٹیکل 90 میں کیا گیا ہے۔ وہ اس آرٹیکل کے تحت بعض دیگر عہدے داروں کے ساتھ مل کر وفاق کے انتظامی اختیارات استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ تاہم اختیارات کا یہ استعمال صرف آئین کے تحت ہی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ آرٹیکل 90 میں صریحاً درج ہے۔ اسی طرح عدلیہ کے جج صاحبان جو حلف آئین

کے تحت اٹھاتے ہیں، اُس میں درج ہے کہ وہ اپنے فرائض کو آئین اور قانون کے مطابق ادا کرنے کے پابند ہیں۔ اسی طرح قومی اسمبلی کے ارکان جو حلف اٹھاتے ہیں، اُس میں بھی یہی درج ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی آئین اور قانون کے مطابق ادا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس منصب کے لئے بھی آئین میں حلف واضح کیا گیا ہے، آئین کی پاس داری اُس حلف کا حصہ ہے۔ ان میں سے ایک حلف جو یہ نکتہ سب سے زیادہ واضح طور پر بیان کرتا ہے، اس میں تحریر ہے کہ ”میں یہ عہد کرتا ہوں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کی پاس داری کروں گا جو کہ پاکستان کے عوام کی منشاء کا مظہر ہے۔“

33۔ لہذا یہ بات واضح ہے کہ ہمارے آئینی نظام کی اساس اسی بنیادی ہدایت پر قائم ہے کہ ریاست کے ہر جزو پر آئین کے مطابق عمل کرنا لازم ہے۔ جہاں کہیں ریاست کے تین اجزاء میں سے کوئی جزو آئین کی وضع کردہ حدود سے تجاوز کرے گا تو یہ کہنا جائز ہوگا کہ اُس نے دراصل پاکستان کے عوام کی منشاء سے روگردانی کی ہے۔ آئین نے ایسا نظام مرتب کیا ہے جس میں ریاست کے مختلف جزو ہم پلہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک عوام کی منشاء کا ترجمان ہے۔

34۔ آئین کے آرٹیکل 190 میں واضح طور پر درج ہے کہ ”پاکستان کے تمام انتظامی اور عدالتی حکام سپریم کورٹ کی معاونت کریں گے“۔ لہذا انتظامیہ کے تمام ارکان بشمول اپیل کنندہ پر لازم ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلوں کے نفاذ اور عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ ایسا نہ کرنا آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ ایسی خلاف ورزی بے حد سنجیدہ مسئلہ ہے اور آئین کے آرٹیکل 204 میں اس کا مکمل ادراک کیا گیا ہے۔ مذکورہ آرٹیکل کے تحت توہین عدالت آرڈی نینس میں توہین کے زمرے میں ہر اُس شخص کو شامل کیا گیا ہے جو عدالت کے کسی ایسے حکم کی خلاف ورزی کرے یا اسے نظر انداز کرے، جس پر عمل کرنا اُس پر لازم ہو۔ یہ امر واضح ہے کہ ان قانونی مندرجات کو اس وسیع انداز میں لکھنے سے آئین اور قانون کا مطمع نظر یہ تھا کہ آئین کو غصب سے محفوظ رکھا جائے اور آئینی نظام میں ملحوظ رکھے جانے والے توازن کو برقرار رکھا جائے۔ زیر نظر مقدمہ جس میں عدالت نے اپیل کنندہ کو اظہار وجوہ کا نوٹس دیا ہے، اس اعتبار سے مختلف نہیں۔ ایسا کر کے عدالت نے آئین کی پاس داری کی ہے۔

35۔ آخر میں دہراتے چلیں کہ اس فیصلے میں اہم آئینی نکات واضح کر دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہم نے دانستہ طور پر اپیل کنندہ کی طرف سے اٹھائے گئے عذرات پر بحث سے گریز کیا ہے۔ شواہد جمع کرنا اور ان کی بنیاد پر مقدمے کا فیصلہ کرنا سات رکنی بنچ کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اس لئے ہم نے اپیل کی فائل پر موجود دستاویزات پر بحث کرنے سے بھی گریز کیا ہے، جس میں 22 ستمبر 2010 کی وزارت قانون کی سمری شامل ہے۔ ایسی دستاویزات کا جائزہ بھی فاضل سات رکنی بنچ

کے دائرہ کار میں ہے۔

36۔ مندرجہ بالا وجوہات ہمارے مختصر حکم مورخہ 10 فروری 2012 کی تائید کرتی ہیں۔

(جواد ایس خواجہ)

بج

Approved for Reporting.